© rasailojaraid.com

نقطۂ نظر

زکوٰۃ و عشر کے علاوہ ٹیکس کی شرعی حیثیت

تحریر : مولانا محمد زاہد ' استاذ جامعہ اسلامیہ امدادیہ ' فیصل آباد

اس تحریر میں دو سوالوں کا قرآن و سنت اور اصول شریعت کی روشنی میں جائزہ لینا مقصود ہے :

۱۔ کیا زکوٰۃ و عشر ٹیکس کے قائم مقام ہو سکتے ہیں اور کیا ان سے وہی مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں جو ٹیکسوں سے حاصل کرنا مقصود ہوتے ہیں ؟

۲۔ اگر پہلے سوال کا جواب نفی میں ہے تو کیا ایک اسلامی ملک کی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ملک چلانے اور سرکاری اخراجات کو پورا کرنے کے لئے عوام پر ٹیکس لگائے ' اگر ایسا اختیار حاصل ہے تو اس کی حدود و قیود کیا ہیں ؟

۱۔ کیا زکوٰۃ و عشر ٹیکس کا متبادل ہو سکتے ہیں ؟

۱ء۱۔ جب ہم خالی الذہن ہو کر قرآن و سنت اور فقہ اسلامی میں بیان کئے گئے زکوٰۃ و عشر کے مقاصد اور ان کی تفصیلات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس سوال کا جواب واضح طور پر نفی میں ملتا ہے جس کی چند وجوہ حسب ذیل ہیں :

۱ء۱ء۱۔ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور اس کے اصل مقاصد روحانی ہیں :

زکوٰۃ اسلامی عبادات میں سے ایک عبادت ہے ' یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں زکوٰۃ کو بیشتر مقامات پر ایمان اور نماز کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ' حضور اقدس ﷺ نے جب حضرت معاذ ؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو دعوت اور تنفیذ احکام کی جو ترتیب بتائی وہ یہی تھی کہ سب سے پہلے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔ اس کے بعد نماز کا حکم بتایا جائے۔ پھر زکوٰۃ کا (۱) اسی وجہ سے زکوٰۃ و عشر کفار پر لاگو نہیں ہوتے ' جو زمینیں کفار کی ملکیت ہوں ' یا کسی علاقے کی فتح کے وقت ان زمینوں پر کفار کی ملکیت کو بر قرار رکھا گیا ہو ' بعد میں اگرچہ وہ مسلمانوں کی ملکیت میں آجائیں ' ان پر عشر واجب نہیں ہوتا بلکہ خراج لیا جاتا ہے۔

عبادات سے اگرچہ بعض مادی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں لیکن ان کے اصل مقاصد روحانی ہوتے ہیں عبادات کی اصل روح یہ ہے کہ زندگی کے بیشتر کام اگرچہ ہم اپنی مرضی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عقل وبصیرت کے مطابق کرتے ہیں لیکن چند ایک کام ایسے بھی ہونے چاہئیں جن میں خالصتاً اس بات کا اظہار ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حاکم ومالک حقیقی ہیں اور ہم ان کے بندے اور غلام۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر نماز کی رکعات وغیرہ میں محض اپنی مرضی سے تبدیل کرنے کے مجاز نہیں ہیں، زکوٰۃ بھی اسی طرح کا ایک رکن اسلام، عبادت اور بندوں کی بندگی کا مظہر ہے۔ اس لئے زکوٰۃ کن اموال پر لاگو ہوگی۔ کس شرح سے واجب ہوگی اور کہاں خرچ کی جائے گی وغیرہ وغیرہ سوالات کے طے شدہ جوابات شریعت میں موجود ہیں جن میں تبدیلی کی گنجائش نہیں جبکہ ٹیکس ایسی چیز ہے جس کے دائرہ وصولی سے لے کر خرچ کے مواقع تک اور اس کے قوانین سے لے کر اس کی شرح (Rate) تک ہر چیز میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے۔

حاصل یہ کہ ٹیکس اصولی طور پر ایک معاشی اور مادی معاملہ ہے جبکہ زکوٰۃ میں روحانی فوائد اور بندگی کا پہلو غالب ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے بھی "حجۃ اللہ البالغہ" میں زکوٰۃ کے اسرار ورموز بیان کرتے ہوئے اسی روحانی پہلو کو اہمیت دی ہے اور زکوٰۃ کا اولین مقصد تہذیبِ نفس کو قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس سے انسان کو روحانی انشراح حاصل ہوتا ہے۔ (۲) دوسری جگہ ہاشمی کے لئے زکوٰۃ جائز نہ ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ زکوٰۃ کے ضمن میں مال کی ظلمت خارج ہوتی ہے اور بعض اہل کشف کو یہ ظلمت نظر بھی آجاتی ہے اور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد بھی ایسے لوگوں میں شامل تھے۔ (۳)

خود لفظ "زکوٰۃ" کے عربی زبان میں ایک معنی تطہیر کے بھی آتے ہیں اور زکوٰۃ سے بھی تطہیر نفس اور تطہیر مال حاصل ہوتی ہے، حضور اقدس ﷺ کے انتقال کے بعد مانعین زکوٰۃ کے متعلق مشکل ترین حالات میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جو مضبوط موقف مشہور ومعروف ہے، یہ بھی زکوٰۃ کے ناقابل تغیر عباداتی پہلو کا عکاس ہے۔ اگر یہ ٹیکس کے قبیل سے کوئی چیز ہوتی تو وقتی مصالح کے تحت اس میں ردوبدل میں بظاہر کوئی حرج نہیں تھا۔

بعض احادیث میں ایک ایسے دور کے آنے کی پیش گوئی کی گئی ہے جب دولت بہت عام ہو جائے گی، اس دور کے بارے میں یہ بھی آتا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے کو فکر اور تلاش ہوگی کہ میں زکوٰۃ کس کو ادا کروں۔ اسے کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملے گا (۴) اگر زکوٰۃ میں یہ عباداتی پہلو غالب نہ ہوتا اور ٹیکس کی طرح وقتی مصالح پر اس کا انحصار ہوتا تو زکوٰۃ قبول کرنے والا تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲ء۱ء۱: زکوٰۃ کے مصارف متعین ہیں:

زکوٰۃ کے مصارف خود قرآن کریم نے متعین کر دیئے ہیں۔ قرآن کریم نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے ہیں جن کا آغاز لفظ "انما" سے کیا ہے جو حصر پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی زکوٰۃ کے مستحق بس یہی لوگ ہیں۔ کسی اور جگہ زکوٰۃ خرچ نہیں ہو سکتی۔ آخر میں "فریضۃ من اللہ" کہہ کر اس کی مزید تاکید کر دی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تعیین ہے۔ (۵) جس میں اپنی مرضی سے ردوبدل نہیں ہو سکتا، حتی کہ خود نبی کریم ﷺ کو بھی اس میں ردوبدل کا اختیار نہیں دیا گیا تھا، چنانچہ زیاد بن حارث صدائی ؓ فرماتے ہیں کہ جب میں پہلی مرتبہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے اور آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے لئے حاضر ہوا تو اسی موقع پر ایک اور شخص بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے زکوٰۃ میں سے کچھ دیجئے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار نہ تو نبی کو دیا ہے اور نہ کسی غیر نبی کو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کے آٹھ مصارف بیان کر دیئے ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی مصرف میں شامل ہوئے تو تمہیں تمہارا حق مل جائے گا ورنہ نہیں (۶) اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی حکمران یا غیر حکمران کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ قرآن کریم میں طے شدہ زکوٰۃ کے ان آٹھ مصارف میں کوئی ردوبدل کرے یا اسے کسی اور جگہ پر خرچ کرے، بلکہ اسے انہی مصارف میں خرچ کرنا ضروری ہے، جبکہ ٹیکس کے ذریعے وصول ہونے والے محاصل صرف انہی آٹھ مواقع پر خرچ نہیں ہوتے بلکہ اس سے پوری سرکاری مشینری کو چلانا مقصود ہوتا ہے جس سے ان آٹھ مصارف کے علاوہ بھی بہت سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔

۳ء۱ء۱: مالک بنا کر زکوٰۃ دینا:

قرآن کریم میں ذکر کردہ آٹھ مصارف کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو ان کے دو گروپ سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی شخص کسی وقتی الجھن میں پھنسا ہوا ہے اسے اس سے نکالنا مقصود ہے، جیسے "الغارمین" کا مصرف یعنی کسی شخص پر قرضہ بہت زیادہ چڑھ گیا ہے یا دیت وغیرہ واجب ہو گئی ہے لیکن وہ ادائیگی کی وسعت نہیں رکھتا تو اس کی طرف سے قرض ادا کر کے اس کی گلوخلاصی کرا دی جائے۔ دوسری قسم کے مصارف وہ ہیں جن پر اس طرح کا کوئی عارضی اور وقتی بوجھ نہیں ہے بلکہ وہ مستقل طور پر مستحق یا مصرف ہیں، دوسری قسم کے مصارف کے لئے قرآن کریم نے "لام" کا لفظ استعمال کیا جو تملیک کے معنی پر دلالت کرتا ہے، جس کا مطلب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہے کہ قرآن کا منشا یہ ہے کہ فقیر اور محتاج کو زکوٰۃ کا مالک بنا کر دی جائے تاکہ وہ اپنی آزادانہ مرضی سے اسے استعمال کرے اور ایک مرتبہ زکوٰۃ وصول کرنے کے بعد وہ زکوٰۃ دہندہ کے کسی طرح بھی زیرِ اثر نہ رہے تاکہ اس کی عزتِ نفس بھی محفوظ رہے' آپ زکوٰۃ کی رقم سے کسی غریب آدمی کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے اس کا کاروبار چلانا چاہتے ہیں تو یہ تو کر سکتے ہیں کہ دوکان تو آپ کی ملکیت رہے اور آپ اسے صرف مفت استعمال کی اجازت دے دیں جس سے وہ مستقل طور پر آپ کا دستِ نگر بن کر رہ جائے۔ قرآن کریم میں زکوٰۃ کے لئے بکثرت "آتوا الزکوٰۃ" یا "یؤتون الزکوٰۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ "ایتاء" کے معنی کسی کو دے دینے یعنی مالک بنا دینے کے ہیں۔ ٹیکس سے حاصل شدہ رقوم جہاں خرچ ہوتی ہیں وہاں ہر جگہ یہ شرط نہیں پائی جاتی' اس لئے بھی زکوٰۃ کا دائرہ کار ٹیکس سے بالکل الگ ہے۔

۴ء ا ا۔ زکوٰۃ سے صرف مستحقین ہی مستفید ہو سکتے ہیں :

اب تک کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ زکوٰۃ و عشر مخصوص لوگوں کا حق ہیں' جو یا تو مستقلاً غریب و محتاج ہیں یا کم از کم اس وقت کسی ایسی مشکل اور مالی ذمہ داری میں پھنس گئے ہیں جس کے نکلنے کی وہ مالی استطاعت نہیں رکھتے۔ حضور اقدس ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے ہوئے جو ہدایات دی تھیں ان میں زکوٰۃ کے متعلق یہ ارشاد فرمایا تھا :

"توخذ من اغنیائھم وترد فی فقرائھم" (۷)

(یعنی یہ زکوٰۃ مالداروں سے لے کر وہیں کے غریبوں میں تقسیم کی جائے گی)

جس کا حاصل یہ ہوا کہ زکوٰۃ کا ایک مقصد دولت کے بہاؤ کو نیچے سے اوپر کی بجائے اوپر سے نیچے کی طرف لانا ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعے امیروں کی دولت کا ایک حصہ ان کی جیب سے نکال کر غریب کی جیب میں ڈال دیا جاتا ہے اور اسے اس کا مالک و مختار بنا دیا جاتا ہے۔ اس لئے زکوٰۃ ایسی جگہ خرچ نہیں ہو سکتی جس کا فائدہ خود زکوٰۃ دینے والے امیر کو بھی پہنچے۔ ٹیکسوں کے محاصل سے جو سرکاری اخراجات پورے کئے جاتے ہیں ان کا فائدہ صرف غریب کو نہیں پہنچتا بلکہ امیر بھی ان سے مستفید ہوتا ہے اور شاید زیادہ مستفید ہوتا ہے۔ ٹیکسوں کی آمدن سے بنی ہوئی سڑک پر غریب کو تو اپنی سائیکل کے لئے ڈیڑھ دو فٹ جگہ درکار ہوتی ہے' باقی سڑک تو امیر کی لینڈ کروزر یا مرسیڈیز کے لئے ہی استعمال ہو گی' ٹیکسوں کی آمدن سے سیورج کا نظام قائم کیا جاتا ہے تو اس سے غریب کم اور امیر زیادہ فائدہ اٹھائے گا' امیر تو دن میں دو مرتبہ کپڑے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تبدیل کرے گا اور غریب شاید دو دن میں بھی ایک مرتبہ کپڑے تبدیل نہ کرے، سرکاری خزانے سے قائم سرکاری دفاتر اور ان میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین کی خدمات سے بھی غریب سے زیادہ امیر مستفید ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں زکوٰۃ کو ٹیکس کے متبادل کے طور پر پیش کرنے اور اسے ٹیکس کی جگہ استعمال کرنے سے اس کے بنیادی فلسفہ پر زد پڑے گی اور نتیجہ "توخذ من اغنیائھم وتردفی فقرائھم" کی بجائے "توخذ من اغنیائھم وتردفی اغنیائھم" نکلے گا۔ زکوٰۃ کو ٹیکس کے متبادل کے طور پر پیش کرنے کا مطلب یہ خواہش ہے کہ امیر سے جو دولت زکوٰۃ کے نام پر لی گئی ہے وہ غریب کی جیب میں جانے کی بجائے کسی نہ کسی طریقے سے خود اس دولت مند کے استعمال میں آجائے۔ یہ زکوٰۃ نہ ہوئی اندھے کی بانٹی ہوئی ریوڑیاں ہوئیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ زکوٰۃ کے بعض مصارف میں بغیر تملیک کے ادائیگی کے بھی اقوال اگرچہ موجود ہیں اور "فی سبیل اللہ" کے مفہوم میں بعض حضرات کافی وسعت کرتے ہیں۔ ان پر مستقلاً بحث ہو سکتی ہے اور عصر حاضر میں اس پر لکھا بھی گیا ہے، یہاں جو بات کہنا اصل مقصود ہے وہ یہ ہے کہ مصارف زکوٰۃ کے بارے میں ایسا نقطۂ نظر اختیار کرنا درست معلوم نہیں ہوتا جس کی وجہ سے حدیثِ معاذؓ میں بیان کردہ "تؤخذ من اغنیائھم وتردفی فقرائھم" والی روحِ زکوٰۃ سرے سے غائب ہو جائے، ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کو ٹیکس کا متبادل قرار دینے سے یہ بنیادی فلسفہ بہت زیادہ متاثر ہوگا۔

بعض اوقات یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ دولت مند لوگوں پر جتنی زکوٰۃ واقعتاً بنتی ہے وہ پوری جمع کر لی جائے تو وہ بہت بڑی مقدار بنتی ہے۔ اس لئے اسے محض چند مصارف تک محدود رکھنے کی بجائے اس سے عام سرکاری اخراجات پورے کر کے ٹیکسوں کو ختم کر دیا جائے۔ اس استدلال کے پیچھے بھی درحقیقت وہی سوچ کارفرما ہے کہ غریب کا حق بھی کسی طرح واپس امیر کو مل جائے۔ اگر زکوٰۃ زیادہ بنتی ہے تو زیادہ غریبوں کو زیادہ مقدار میں مل جانے میں کیا قباحت ہے۔ یہ تو دین کا کوئی اصول نہیں ہے کہ غریب کو قوت لایموت ہی ملنی چاہیے۔ غریب کو غریب ہی رہنے دیا جائے، کہیں اسے اتنی زکوٰۃ نہ مل جائے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر امیر بن جائے۔ احادیث میں جو ایسے دور کی پیش گوئی کی گئی ہے جس میں غریب اور زکوٰۃ کا مستحق تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ شاید اسی اصول پر عمل درآمد کی برکت سے ہوگا کہ زکوٰۃ اگر زیادہ بھی بنتی ہے تب بھی وہ غریبوں ہی کو دی جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲ء۱۔ زکوٰۃ و عشر سے ملکی قرضوں کی ادائیگی:

ملک اس وقت جن ملکی اور غیر ملکی قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے اس سے نکلنا اس وقت ایک سنجیدہ اور گھمبیر مسئلہ ہے۔ کی تجویز آج کل یہ بھی پیش کی جا رہی ہے کہ زکوٰۃ فنڈ سے یہ قرضے ادا کر دیئے جائیں۔ غالباً اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اس پر کچھ کام کیا ہے۔ اس تحریر کے دوسرے نکتے کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز پر بھی اپنی طالب علمانہ گذارش پیش کر دی جائے۔ حتمی فیصلہ کرنا بہر حال اہل علم کا کام ہے۔

راقم الحروف کے طالب علمانہ خیال کے مطابق یہ تجویز شرعاً قابل قبول ہو سکتی ہے بشر طیکہ اس کے لئے درج ذیل فار مولا اپنایا جائے۔

۱۔ حکومت کے ذمے واجب الادا قرضوں کو ملک کی پوری آبادی یا بالغ افراد پر تقسیم کر کے یہ حساب لگایا جائے کہ فی کس کتنا قرض بنتا ہے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر ہر فرد اتنی مالیت کا مقروض ہے۔

۲۔ قرضوں کی ادائیگی کے لئے ہر شخص پر یا ہر بالغ فرد پر سالانہ ایک مخصوص مقدار لاگو کی جائے کہ وہ انہیں قرض کی ادائیگی کے لئے ادا کرنا ہو گی۔

۳۔ پوری آبادی کو دو کیٹگریز میں تقسیم کیا جائے۔

(الف) وہ لوگ جن کے کل اثاثہ جات میں سے نمبر ۱ میں مذکور قرض کی مالیت منہا کر لی جائے تب بھی وہ شرعی اصطلاح کے مطابق غنی رہتے ہیں اور نمبر ۲ میں مذکور سالانہ مقدار ادا کرنے سے ان پر نا قابلِ تحمل بوجھ نہیں پڑتا۔

(ب) وہ لوگ جن کے اثاثہ جات سے مذکورہ قرض کی مالیت کے برابر منہا کر لیں تو وہ صاحبِ نصاب اور غنی نہیں رہتے۔ یا مذکورہ سالانہ مقدار ادا کرنے کی وہ استطاعت نہیں رکھتے۔

۴۔ کیٹگری "الف" کے لوگوں سے اتنی رقم سالانہ عملاً وصول کی جائے اور کیٹگری "ب" کے لوگوں کی طرف سے ان پر واجب الادا رقم زکوٰۃ فنڈ میں سے دے دی جائے۔ اس لئے کہ وہ "الغارمین" میں داخل ہیں۔

اس طرح پوری قوم قرضوں کا بوجھ اتارنے میں شامل ہو گی، دولت مند عملاً ادائیگی کریں گے اور غریبوں اور کم مالی استطاعت رکھنے والے لوگوں کی طرف سے زکوٰۃ سے ادائیگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جائے گی۔ لیکن اگر کیٹیگری "الف" سے اس مد میں کچھ لئے بغیر زکوٰۃ سے قرضوں کا بوجھ اتارا جائے تو زکوٰۃ چونکہ صرف غریبوں کا حق ہے اس لئے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرض صرف غریب ہی ادا کر رہے ہیں جو کہ صریح ناانصافی ہے خاص طور پر اس وجہ سے کہ حکومتی سطح پر حاصل کئے گئے قرضوں سے غریب نے بہت کم استفادہ کیا ہے۔

۲۔ اسلام میں ٹیکس کا حکم :

قرون اولیٰ میں سرکاری اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ٹیکس کے علاوہ دیگر محاصل پر انحصار کیا جاتا تھا۔ جیسے زکوٰۃ' عشر' خراج' جزیہ مال فئی اور مالِ غنیمت کا خمس وغیرہ۔ ان میں سے زکوٰۃ و عشر کو تو مخصوص مصارف پر خرچ کیا جاتا تھا لیکن باقی ذرائع سے ہونے والی آمدن کاروبار مملکت چلانے اور دیگر رفاہی منصوبوں' وظائف' بیروزگاری و ضعیفی الاؤنس وغیرہ پر خرچ کی جاتی تھی۔ ان مدات میں آمدن اتنی زیادہ ہو جاتی تھی کہ ریاست کو عوام سے کسی قسم کا ٹیکس لینے کی عموماً ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی جس کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کے زمانے میں صرف کوفہ کے علاقے سے صرف خراج کی مد میں آمدن سو ملین درہم ہوتی تھی (۷) امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج کی ایک روایت کے مطابق جب حضرت ابو ہریرہؓ بحرین سے وصولیاں کر کے آئے اور آکر حضرت عمرؓ کو وصول شدہ مقدار بتائی تو حضرت عمرؓ کو یقین نہ آیا اور فرمایا کہ شاید تم سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے اونگھ رہے ہو۔ جاؤ جا کر پہلے آرام کرو' پھر آکر مجھے حساب بتانا۔ رات گزارنے کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ دوبارہ حساب بتانے کے لئے حاضر ہوئے تو کل والا حساب ہی درست تھا (۸) ان حالات میں ظاہر ہے کہ کسی مزید ٹیکس کی ضرورت نہیں ہو سکتی تھی۔ دورِ فاروقی میں اگر کسی ٹیکس کی مثال ملتی ہے تو وہ امپورٹ ڈیوٹی ہے جو دوسرے ملکوں سے آنے والے مال تجارت پر کاٹی جاتی تھی اور مسلمان کے مال سے لی گئی ڈیوٹی کو زکوٰۃ تصور کر لیا جاتا تھا۔ اس امپورٹ ڈیوٹی (جسے اصطلاح میں "عشور" کہا جاتا ہے) میں دو اصول مدنظر رکھے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ جو ملک ہمارے مالِ تجارت پر جتنی ڈیوٹی لگاتا ہے ہم بھی ان کی طرف سے آنے والے مال پر اتنی ہی ڈیوٹی لگائیں گے۔ جو ملک ہمارے مال پر ڈیوٹی نہیں لگاتا ہم بھی ان کے مال پر ڈیوٹی نہیں لگائیں گے۔ دوسرے یہ کہ اس مال کی درآمد سے ہماری معیشت پر کیا اثرات مرتب ہوں گے اور ہمیں اس کی ضرورت کس قدر ہے۔ عام ضرورت کی اشیاء کی درآمد کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ڈیوٹی کم بھی کر دی جاتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی اور بعض اوقات بالکل ختم بھی کر دی جاتی تھی (۹) بہر حال عمومی طور پر اس دور میں اس طرح کے ٹیکسوں کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی جو آج کل دنیا کے بیشتر ملکوں میں مروج ہے۔

یہ بات تو پہلے واضح ہو چکی ہے کہ زکوٰۃ کو ٹیکس کے متبادل کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا اور ٹیکس کے علاوہ دیگر ذرائع آمدن آج کل بیشتر ملکوں کی حکومتوں کے لئے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سوائے ان ملکوں کے جو تیل اور معدنیات وغیرہ کی دولت سے مالا مال ہیں۔ دوسری طرف حکومتوں کے اخراجات موجودہ دور میں بہت بڑھ چکے ہیں۔ صرف دفاع ہی کو لے لیجئے۔ یہ آج کل اتنا مہنگا ہے کہ گزشتہ صدیوں میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تقریباً یہی صورت حال لاء اینڈ آرڈر کی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں ملک اور حکومت کو کیسے چلایا جائے۔ اس مقصد کے لئے ٹیکس لگانے کی شرعاً کس حد تک گنجائش ہے؟ آئندہ صفحات میں اسی سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱ء۲۔ اجتماعی مسائل میں شریعت کا عمومی مزاج :

آگے بڑھنے سے پہلے یہ اصولی بات ذہن میں رکھ لینا ضروری ہے کہ شریعت کا احکام دینے کا انداز عبادات اور ارتفاقات (جو کام دنیوی انفرادی یا اجتماعی ضرورت کے لئے کئے جاتے ہیں) میں الگ الگ ہے۔ عبادات میں تو ایک لگا بندھا طریقہ بتایا جاتا ہے اور جزوی تفصیلات تک طے کر دی جاتی ہیں۔ محض عمومی اور اصولی حکم دے کر یہ نہیں کہہ دیا جاتا ہے کہ تفصیلی طریقہ کار تم خود طے کر لو۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ میں یہی انداز اپنایا گیا ہے۔ لیکن ارتفاقات جیسے کھانا، پینا، لباس، شادی بیاہ، سیاست و ریاستی امور وغیرہ میں شریعت کا انداز دوسرا ہے۔ ان میں کچھ اصولی احکامات دے کر باقی تفصیلات لوگوں پر چھوڑ دی گئی ہیں کہ وہ اپنے لئے جو طریقِ کار مناسب سمجھیں اختیار کر لیں۔ مثلاً لباس میں لباس کی خاص شکل متعین کر کے یہ نہیں کہا گیا کہ یہ اسلامی وردی ہے جو ہر مسلمان کو پہننی ہو گی، بلکہ کچھ عمومی اور اصولی ہدایات دے کر یہ اختیار دے دیا گیا کہ ان اصول اور تعلیمات کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے اپنے اپنے رسم و رواج اور سہولت و پسند کے مطابق لباس کا جو انداز چاہیں اختیار کر لیں، سیاست و قانون اور دیگر ریاستی اور اجتماعی امور کے بارے میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ اگر ٹیکس کا کوئی تصور یا اس کی کوئی گنجائش اسلام میں موجود ہے تو اس کے بارے میں ایک لگا بندھا طے شدہ نظام بھی ہمیں اسلامی تعلیمات میں مل جائے گا، بلکہ یہاں بھی دیگر اجتماعی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شعبوں کی طرح کچھ اصول اور عمومی ہدایات ہی ملیں گی جنہیں روبہ عمل لانے کے لئے طریقے ہمیں اپنے حالات کے مطابق خود سوچنے ہوں گے۔ سطور ذیل میں بھی انہی اصولی مباحث پر گفتگو کی جائے گی۔

۲ء۲۔ کیا ملکی ضروریات کے لئے ٹیکس لگانے کی گنجائش ہے؟

۱ء۲ء۲۔ ٹیکس ہمیشہ حکومت کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے۔ اس لئے اسلام میں ٹیکس کی حیثیت کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام میں حکومت کا تصور کیا ہے۔ اسلامی میں تصور حکومت اگرچہ وسیع موضوع ہے لیکن ہمارے موضوع سے اس کا جو پہلو تعلق رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ حکومت جو ذمہ داریاں ادا کرتی ہے جیسے اسلامی ریاست کی سرحدوں کی حفاظت و دفاع، نظام عدل کا قیام، امن و امان کا قیام، شہریوں کی اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنا وغیرہ، یہ ذمہ داریاں دراصل کسی خاص فرد یا ادارے پر عائد نہیں ہوتیں بلکہ پورے اسلامی معاشرے پر عائد ہوتی ہیں۔ تمام افراد ملت پر عائد ہونے والی ان ذمہ داریوں کی بجاآوری کی اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہوسکتی کہ یہ سب مل کر حکومت کے ادارے کو اپنا نمائندہ اور وکیل بنالیں اور وہ ان ضرورتوں کی تکمیل کرے۔ فقہاء نے جابجا اس بات کی تصریح کی ہے کہ حکومت جو کام کرتی ہے ان میں وہ عامۃ المسلمین کی وکیل اور نمائندہ ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ کاسانی نے بدائع الصنائع میں ایک مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام کسی کو قاضی بناتا ہے تو اگرچہ بظاہر دیکھنے میں اسے قاضی امام نے بنایا ہے لیکن درحقیقت اسے قاضی بنانے والے عامۃ المسلمین ہی ہیں، اس لئے کہ امام نے اس کے تقرر کا حکم عام مسلمانوں کی نیابت میں ہی انجام دیا ہے۔ (۱۰)

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں پسندیدہ ترین اور مثالی صورت یہی ہے کہ حکومت کا تعین عوام کی مرضی و منشا سے ہو، اور یہ ذمہ داری ان لوگوں پر عائد کی جائے جو عوام میں زیادہ مقبول ہوں، اگر چند افراد خود ہی کسی طریقے سے حاکم بن بیٹھتے ہیں تو اسے صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ (۱۱)

بہر حال حکومت جو ذمہ داریاں ادا کرتی ہے وہ درحقیقت پورے مسلمان معاشرے کی طرف سے ایک فرض ادا کر رہی ہوتی ہے۔ اگر ان فرائض کی بجاآوری کیلئے پیسوں کی ضرورت ہو اور یہ ضرورت لازماً ہوگی۔ اور ان پیسوں کے حصول کے دیگر ذرائع موجود نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ پیسے انہی لوگوں کو جمع کرنا ہوں گے جن کا یہ کام ہے۔ اور ملک چلانا چونکہ پورے معاشرے کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کام ہے اس لئے پیسوں کی ضرورت کی صورت میں اس مقصد کے حصول یا مشترکہ ذمہ داری کی بجا آوری کے لئے باہمی تعاونی چندے کی ہے۔ چنانچہ ٹیکس کی اس حیثیت کو فقہاء نے تسلیم کیا اور اس کی ادائیگی کو لازمی قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں دو حوالے نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے :

فقہاء حنیفہ نے اس طرح کے ٹیکس کو "نوائب" کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ فقہ حنفی کی معروف کتاب "ہدایہ" میں کفالۃ (کسی کا ضامن بننا) کے احکام ذکر کرتے ہوئے اس مسئلے پر بحث کی گئی ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی طرف سے "نوائب" کا کفیل بن سکتا ہے یا نہیں اس مسئلے کے تحت "نوائب" کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک "حق" اور دوسرے "ناحق" نوائب حق سے مراد یہ ہے کہ کسی مشترکہ مقصد کے لئے ضرورت کے تحت مالدار لوگوں پر حکومت کی طرف سے کچھ رقم کی ادائیگی لازم کردی جائے۔ اس کی چند مثالیں دی ہیں۔ جیسے نہروں کی کھدائی، محلوں میں چوکیداروں کا تعین، فوجوں کی تیاری اور انہیں ضروری سازوسامان مہیا کرنا، کچھ مسلمان کافروں کی قید میں ہوں انہیں چھڑانا، اس طرح کے مقاصد کے لئے جو ٹیکس لگائے جاتے ہیں وہ نوائب حق" ہیں۔ ان کی ادائیگی مالدار لوگوں پر واجب ہے۔ (۱۲) یہ بات ہدایہ کے معروف شارح اور حنفی فقیہ ابن الہمام نے زیادہ صراحت وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے۔ (۱۳) ابن الہمام کی عبارت بعد کے تمام حنفی فقہاء نے اپنی کتابوں میں ذکر کی ہے۔ ضرورت کی نوعیت اور اس کی مثالیں وقت کے بدلنے سے بدل سکتی ہیں۔ ان فقہاء نے جو بنیادی تصور پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ جو ضرورت مشترک ہے اور اس کا تعلق بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے ساتھ ہے لیکن اسے پورا کرنے کے لئے سرکاری خزانے کے دوسرے ذرائع آمدن نہیں ہیں تو اس کے لئے مالدار لوگوں پر "لازمی چندہ" عائد کیا جاسکتا ہے۔ اس کا نام خواہ ٹیکس رکھ لیا جائے، نوائب رکھ لیا جائے یا کچھ اور۔

عہد رسالت اور قرون اولی میں فوجوں کی باقاعدہ تشکیل سے پہلے کے دور میں اس کی ایک نظیر یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ اس زمانے میں جب کسی شخص کی جہاد کے لئے تشکیل ہوتی تھی تو جہاد پر جانا اس پر واجب ہو جاتا تھا اور سواری، اسلحہ اور زادراہ وغیرہ (صاحب حیثیت ہونے کی صورت میں) اس کے اپنے ہوتے تھے۔ گویا حکومت کے حکم پر اسے جہاد کے لئے لازمی طور پر اپنا مال بھی خرچ کرنا پڑتا تھا۔

اس سلسلے میں یہاں جو دوسرا حوالہ پیش کرنا مقصود ہے وہ معروف مالکی فقیہ اور اصول فقہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے عالم شاطبی ہیں، وہ اپنی کتاب ''الاعتصام'' میں لکھتے ہیں کہ اگر ملک پھیل چکا ہو، اس کی حفاظت کے لئے فوجیں بڑھانے کی ضرورت ہو اور بیت المال کی (روایتی آمدنی) میں اتنی گنجائش نہ ہو تو حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مالدار لوگوں پر خاص شرح سے ٹیکس عائد کر دے۔ جس سے ضرورت بھی پوری ہو جائے لیکن دینے والوں پر ناروا بوجھ بھی نہ بنے اور معاشرے میں اس کی وجہ سے بے چینی بھی پیدا نہ ہو (شاطبی نے ایحاش القلوب کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی لوگوں کو وحشت میں ڈالنا) (۱۴)۔

شاطبیؒ نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہی بات امام غزالی (شافعی فقیہ) نے اپنی متعدد کتابوں میں لکھی ہے اور ابن العربی (مالکی) نے بھی ''احکام القرآن'' میں اسے درست قرار دیا ہے۔

شاطبیؒ نے اس مسئلے پر استدلال کرتے ہوئے ایک اہم بات یہ کہی ہے کہ یہ درست ہے کہ مالدار لوگوں سے حکومت جب کچھ وصول کرے گی تو ان پر بوجھ ہوگا اور کسی قدر ان کا نقصان بھی ہوگا، لیکن اس طرح کی وصولی نہ کرنے کی صورت میں اسلامی ریاست کو جو حیثیت مجموعی نقصان پہنچ سکتا ہے اور جس سے خود یہ مالدار لوگ بھی متاثر ہوں گے وہ اس نقصان اور بوجھ سے کہیں زیادہ ہے جو انہیں یہ پیسے دیتے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔

شاطبیؒ کا یہ بھی کہنا ہے کہ قرون اولیٰ میں اس طرح کی وصولیوں کا رواج اس لئے نہیں ملتا کہ اس زمانے میں بیت المال کے دیگر ذرائع آمدن بہت زیادہ ہوتے تھے (جس کی طرف اس مضمون میں پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے) اس لئے اس دور میں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، اگر مستقبل قریب میں بیت المال کو ٹیکسوں کے علاوہ کسی اور ذریعے سے آمدن کی توقع ہو تو ضرورت قرض لے کر بھی پوری کی جا سکتی ہے، لیکن اگر ایسی کوئی توقع نہ ہو تو حکومت کا قرضے لینا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ (۱۵)

ان دو حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حنفی، شافعی اور مالکی فقہاء کے نزدیک اسلامی ریاست کی ضروریات پورا کرنے کا اگر کوئی اور ذریعہ نہ ہو تو مالدار لوگوں پر بقدر ضرورت اور بقدر تحمل، عدل کے عمومی تقاضوں کے دائرے میں رہتے ہوئے ٹیکس لگایا جا سکتا ہے اور شہریوں کی یہ ذمہ داری بلکہ ان کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ یہ ٹیکس ادا کریں۔

اب تک کی پوری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ملک چلانا سب شہریوں کا کام ہے، حکومت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادارہ توان کی نمائندگی میں یہ کام انجام دیتا ہے'اس لئے ٹیکس دیتے وقت وہ کسی "اور" کو نہیں دے رہے ہوتے بلکہ اپنے ہی کام پر خرچ کر رہے ہوتے ہیں۔گویا یہ مشترک مقصد کے لئے "چندہ" ہے لیکن عملاً یہ تصورتب کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ "ملک خدا کے بعد عوام کا ہے" اور "نمائندہ حکومت "کا تصور زندگی کے ہر شعبے میں اجاگر ہو اور دورِ غلامی میں حکومت اور شہریوں کے درمیان جو اجنبیت پیدا ہو گئی تھی اسے اپنائیت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے'تاکہ ٹیکس دہندگان کو یہ احساس ہو کہ ٹیکس وصول کرنے والی حکومت ہماری ہی نمائندہ اور ہمارا ہی کام کر رہی ہے۔یہ کوئی فاتح قوم نہیں جو ہم مفتوحوں سے خراج وصول کر رہی ہے۔

۲ء۲ء۲۔ قانون کی پابندی اور ٹیکس :

فقہاء نے "نوائب" پر گفتگو کرتے ہوئے ایک اور اہم شرعی اصول کا حوالہ دیا ہے'وہ یہ کہ مسلمان حکومت کے ایسے احکامات جن میں مسلمانوں کا عمومی مفاد ہو پر عمل کرنا شرعاً واجب ہے بشر طیکہ اس پر عمل کرنے سے کسی معصیت کا ارتکاب نہ کرنا پڑتا ہو(۱۶)خود قرآن کریم میں ہے :

"اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم"(۱۷)

(اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اولو الامر (حکام) کی)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان جس اسلامی ملک میں رہ رہا ہے وہاں کے ایسے قوانین جو خلافِ شریعت نہ ہوں کا احترام اس پر واجب ہے بلکہ مسلمان اگر کسی غیر مسلم ملک کا شہری بھی ہے تب بھی اس پر اس ملک کے قوانین کی پابندی لازمی ہے'اس لئے کہ کسی ملک کی شہریت اختیار کرنا عملاً اس بات کا معاہدہ ہوتا ہے کہ میں وہاں کے قوانین کی پابندی کروں گا۔اور مسلمان ملک میں قوانین کی یہ پابندی دو حوالوں سے لازمی ہو گی'ایک یہی معاہدے والی بات'دوسرے مسلمان اولو لامر کی اطاعت واجب ہونے کی وجہ سے۔

ٹیکس کا معاملہ بھی قانون کے ساتھ تعلق رکھتا ہے'ملک کا قانون اگر ٹیکس کی ادائیگی کو لازمی قرار دیتا ہے تو مذکورہ اصول کے مطابق جس پر اس ٹیکس سے ناروا اور ناقابل تحمل بوجھ نہیں پڑتا اس پر اس کی ادائیگی لازمی ہو گی۔اس لئے کہ ٹیکس کے نظام اور خرچ کرنے کے انداز میں پائی جانے والی خرابیوں کے باوجود موجودہ دور میں یہ بات واضح ہے کہ ٹیکس کے بغیر عموماً ملک چلانا انتہائی مشکل ہوتا ہے'لیکن ٹیکس دہندگان سے اس اصول پر عمل درآمد کے لئے ایک تو یہ ضروری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ خود حکومت اور ٹیکس وصول کرنیوالے سرکاری ادارے بھی ٹیکس قوانین کا پورا پورا احترام کریں، دوسرے یہ ضروری ہے کہ بحیثیت مجموعی ملک میں قانون پسندی اور قانون کے احترام کی فضا پیدا کی جائے، اس کے بغیر "ٹیکس کلچر" پیدا کرنے کا ارادہ محض ایک تخیل ہی ہو سکتا ہے۔ آج ہم ٹیکس کلچر کے حوالے سے دنیا کے جن ملکوں کی مثالیں دیتے ہیں وہاں اوپر سے لیکر نیچے تک ہر سطح پر قانون کو قانون سمجھنے کی فضا بھی موجود ہے، جبکہ ہم بدقسمتی سے نصف صدی میں آئین اور دستور کی اہمیت اور اس کے تقدس کو ہی نہیں سمجھ پائے۔ چھوٹے موٹے قوانین کی یہاں کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ انتہائی معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ اگر اوپر والوں کے پاس آئین کی خلاف ورزی اور اپنے حلف سے انحراف کے جواز کے دلائل موجود ہیں تو عام آدمی بھی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کا کوئی جواز پیش کر سکتا ہے۔ وہ بھی اپنے لئے کسی "نظریہ ضرورت" کا متلاشی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ کسی قانون یا نظام کو محض اس بنیاد پر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انگریز یا کسی اور غیر مسلم کا بنایا ہوا ہے۔ اس لئے کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ زندگی کے اجتماعی شعبوں کے بارے میں اسلام نے ہمیں اصولی تعلیمات دے کر تفصیلات کو ہر زمانے کے حالات پر چھوڑ دیا ہے، ان تفصیلات میں اگر غیر مسلموں کے تجربے سے بھی استفادہ کر لیا جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں "دیوان" کا جو نظام قائم کیا گیا تھا جسے حضرت عمرؓ کے اہم ادارتی کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے اس میں کافی حد تک قدیم فارسی اور رومی (بیزنطینی) نظام سے استفادہ کیا گیا تھا۔ البتہ ان میں جو باتیں اسلامی تعلیمات کے خلاف تھیں انہیں نکال دیا گیا تھا۔ بلکہ عبد الملک بن مروان کے زمانے تک عراق کا دیوان فارسی اور شام کا رومی زبانوں میں رہا۔ بعد میں انہیں عربی میں منتقل کیا گیا۔ (۱۸) بہر حال کسی قانون یا نظام کو مسترد کرتے وقت دیکھنے کی اصل بات یہ نہیں کہ یہ کس کا بنایا ہوا ہے بلکہ اصل قابلِ غور بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں کون کون سی باتیں اسلامی تعلیمات یا مصلحت عامہ کے خلاف ہیں۔

۲،۳۔ ٹیکس لاگو کرنے کے کچھ اصول :

شریعت کا عام اصول یہ ہے کہ کسی بھی شخص کے لئے کسی کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے اپنے آخری حج کے موقع پر فرمایا کہ تمہاری جان، تمہارے مال اور تمہاری عزت و آبرو کی حرمت ایک دوسرے پر ایسی ہی ہے جیسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس شہر' اس مہینے اور اس دن کی حرمت ہے۔ یہ اصول حکومت پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ لہذا اس کے لئے بھی کسی کی ملکیت میں اس کی دلی رضامندی کے بغیر مداخلت جائز نہیں ہے۔ نوائب وغیرہ کے نام سے جو ٹیکس وغیرہ کی اجازت دی گئی ہے وہ ایک مشترکہ ضرورت ومقصد اور مصلحت عامہ کے تحت اس اصول سے ایک استثناء ہے۔ اس لئے ٹیکس کی شرح اور مقدار اس کی وصولی کے نظام وطریق کار میں بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ ایک ایسا کام ہے جس کی ضرورت کے تحت ہی اجازت دی گئی ہے۔ لہذا اس کی وجہ سے لوگوں پر بوجھ بھی بقدر ضرورت ہی پڑنا چاہیے' قرون اولیٰ میں چونکہ جدید انداز کے ٹیکس ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے مروج نہ تھے اس لئے ان کی وصولی کے صریح اصول ملنا تو مشکل ہیں' البتہ زکوٰۃ وعشر' خراج اور جزیہ کی وصولی میں جن اصولوں کو اس دور میں اپنایا گیا ہے ان سے ٹیکسوں کی وصولی کے اصولوں کے لئے بھی راہ نمائی ملتی ہے۔ اس لئے ان میں سے چند اہم اصول یہاں ذکر کیے جاتے ہیں :

۱ء۳ء۲۔ ٹیکس کی مقدار بقدر استطاعت ہو :

ٹیکس صرف صاحبِ حیثیت لوگوں پر لگایا جانا چاہیے اور وہ بھی ان کی حیثیت کے مطابق' جب عراق فتح ہوا تو وہاں کی زمینوں کا سروے اور دوسرے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہؓ اور حضرت عثمانؓ بن حنیف کو بھیجا۔ انہوں نے آکر تفصیلی رپورٹ دی اور یہ بھی بتایا کہ ہم نے ان پر اتنا خراج مقرر کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے ان کی استطاعت سے زیادہ ان پر بوجھ ڈال دیا ہو' ان حضرات نے بتایا کہ ہم نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ ان کی زمینوں کی پیداواری حیثیت وصلاحیت سے زیادہ ان پر خراج نہ لگایا جائے۔ حضرت عثمان بن حنیفؓ نے کہا کہ میں نے اپنے متعلقہ علاقوں میں جتنا خراج لگایا ہے اگر اس سے دوگنا بھی لگایا جاتا تو ان پر بوجھ نہ ہوتا۔ حضرت حذیفہؓ نے بھی یہی کہا کہ ان کی حیثیت کے مطابق مزید خراج کی گنجائش تھی' ہم نے اس سے بہت کم لگایا ہے۔ (۱۹)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عدی بن ارحلاۃ کے نام ایک خط میں لکھا :

> "جزیہ انہی لوگوں پر لاگو کرنا جو اس کی طاقت رکھتے ہوں' اور زمینوں کی آبادکاری کے سلسلے میں ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بننا' اس لئے کہ اس میں مسلمانوں کی معیشت کی درستگی اور ان کے لئے دشمن کے خلاف قوت کا ذریعہ ہے" (۲۰)

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اقتصادی سرگرمیوں میں گھٹن کا ماحول پیدا ہونے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جا جائے تو معاشی استحکام آتا ہے دوسرے یہ معلوم ہوا کہ مضبوط دفاع کا انحصار بھی مضبوط معیشت پر ہے، خلفاء راشدین کے اقوال اور امام ابو یوسفؒ اور ابو عبیدؒ جیسے حضرات کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اس کا پورا ادراک تھا کہ محاصل کی وصولی میں زیادہ بوجھ ڈالنے اور طریقہ کار میں سختی، تشدد اور شک و شبہ کا انداز اختیار کرنے سے پیداواری عمل پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

"المعتدی فی الصدقة کمانعها" (۲۱)

(زکوٰة کے معاملے میں زیادتی کرنے والا زکوٰة دینے سے انکار کرنے والے کی طرح ہے)

متعدد شارحین نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص زکوٰة کی وصولی میں زیادتی کرتا ہے، مثلاً جتنی بنتی ہے اس سے زائد لیتا ہے یا کسی اور طرح سے زکوٰة دہندہ کو پریشان کرتا ہے تو وہ در حقیقت زکوٰة سے فرار کا راستہ کھولتا ہے۔ اس سال تو اس زکوٰة دہندہ کے ساتھ جو ہوگی وہ بھگت لے گا لیکن آئندہ زکوٰة سے بچنے کی جو ترکیب اس سے ہو سکی اسے روبہ کار لانے کی کوشش کرے گا۔ اور اگر زکوٰة وصول کنندگان کی طرف سے اس طرح کی زیادتیاں بکثرت ہونے لگیں تو اس سے (Zakat Evsion) کا مرض پیدا ہوگا، فریقین میں حیلہ بازی کی جنگ شروع ہو جائے گی اور یوں بیت المال میں زکوٰة فنڈ میں اضافے کی بجائے کمی واقع ہوگی۔ جس کے ذمہ دار در حقیقت یہ زیادتی کرنے والے وصول کنندگان ہی ہیں۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ نے انہی "مانع زکوٰة" قرار دیا ہے۔ (۲۲) نیز اس سے اموال چھپانے کا رجحان پیدا ہونے کی وجہ سے پیداواری سرگرمیوں میں کھلا پن نہیں رہے گا، جس کا بالواسطہ اثر محاصل پر بھی پڑے گا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے اپنے اس حکم کہ "جس میں جزیہ کی استطاعت نہ ہو اس سے تخفیف کر دی جائے" وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"فانا لا نریدهم لعام او عامین" (۲۳)

یعنی ہمارا ان سے معاملہ ایک دو سال کا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹیکس دہندہ کی حیثیت واستطاعت دیکھے بغیر ہر حال میں زیادہ سے زیادہ ریونیو اکٹھا کرنے کے شوق سے وقتی فائدہ تو شاید کبھی ہو جاتا ہو مگر مستقل بنیادوں پر سوچا جائے تو اس میں نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ مذکورہ حدیث مبارک اور حضرت عمرؓ کے ارشاد میں اسی حقیقت کی نشاندھی کی گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہتر یہ ہے کہ ملک میں ایک ایسی نمائندہ اتھارٹی موجود ہو جو حکومت کی ضروریات اور ٹیکس دہندگان کی مشکلات دونوں کو سمجھ کر دونوں کے درمیان پل کا کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

۲ء۳ء۲۔ ٹیکس افسران اور عملے کے اوصاف :

امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں خراج کے محکمے کے افسران کے لئے مطلوبہ اوصاف پر بھی تفصیل سے گفتگو کی ہے' ان کا خلاصہ یہاں درج کیا جارہا ہے۔(ٹیکس آفیشلز کے تقرر میں بھی حتی الامکان ان اوصاف کی رعایت رکھی جانی چاہیے)

وہ دین دار' امانت دار ہوں' سمجھ دار اور اہل رائے ہوں' مشورہ کرنے کے عادی ہوں' دینی تعلیمات سے واقف ہوں' حفاظتِ حق اور ادائے امانت میں کسی کی ملامت کی پروانہ کرتے ہوں' سخت مزاج اور لوگوں کی تحقیر کرنے والے نہ ہوں' نرمی کے موقع پر نرمی اور سختی کے موقع پر سختی کے عادی ہوں' خراج طے شدہ قوانین اور قواعد کے مطابق ہی اصول کریں' خود اپنے پاس سے طریقے اور قاعدے نہ گھڑیں' حاصل یہ کہ اس شعبے کے افسران کے تقرر میں وہی احتیاط پیش نظر رہے جو قاضیوں کے تقرر میں ہونی چاہیے۔(۲۴)

۳ء۳ء۲۔ ٹیکس کی وصولی کا لائحہ عمل :

ٹیکس کی وصولی کے سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ ٹیکس دہندگان کو بلاوجہ تنگ اور پریشان نہ کیا جائے' ان کے ساتھ حقارت آمیز رویہ اختیار نہ کیا جائے' طے شدہ قوانین کی پابندی کی جائے۔

امام ابو یوسفؒ نے ریونیو کا نظام ٹھیکے پر دینا پسند نہیں کیا' اس کی وجہ انہوں نے اپنے زمانے کے حالات کے مشاہدے کے بعد یہ بیان کی ہے کہ یہ ٹھیکیدار اپنا نفع زیادہ سے زیادہ بچانے کے لئے لوگوں کو تنگ اور پریشان کرتے' ان کی تحقیر کرتے اور ان پر طرح طرح کے جسمانی تشدد کرتے ہیں' جس سے لوگ پریشان ہوتے ہیں اور بالواسطہ ان کا اثر زمینوں کی پیداواری صلاحیت پر پڑتا ہے (خراج زرعی زمینوں پر ہوتا ہے تھا) جس سے آخرکار خود حکومت کے لئے بھی خراج کی مد میں آمدن کم ہو جاتی ہے۔(۲۵)

امام ابو یوسفؒ نے محاصل کے نظام میں خاص طور پر عدل پر بہت زیادہ زور دیا ہے' اور یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ عدل وانصاف کے ساتھ اور ظلم وزیادتی سے بچ کر محاصل اکٹھے کیے جائیں تو اس میں اخروی اجر وثواب تو ہے ہی' دنیوی اعتبار سے بھی اس سے ملک آباد ہوتے اور سرکاری آمدن میں اضافہ ہوتا ہے اور ظلم وزیادتی کے ساتھ وصولیاں کی جائیں تو اس سے ملک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برباد ہوتے اور سرکاری محاصل میں بھی کمی واقع ہوتی ہے' امام ابو یوسفؒ نے یہ کتاب ہارون الرشید کے لئے اسلام کے مالیاتی احکام پر لکھی تھی' کتاب کا موضوع بظاہر خشک اور تکنیکی قسم کا ہے' بظاہر کتاب کا اسلوب بیان بھی ایسا ہی ہونا چاہیے' لیکن جہاں عدل کی بات آتی ہے وہاں امام ابو یوسفؒ ذرا جذباتی ہو جاتے اور رقت آمیز ناصح کا روپ اختیار کر لیتے ہیں' اور ہارون الرشید کی قلم رو میں ہونے والی زیادتیوں کے تذکرے سے بھی نہیں چوکتے۔

امام ابو یوسفؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ٹیکس کی وصولی کے لئے ضرب اور جسمانی تشدد کا سہارا نہ لیا جائے' اس سلسلے میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ عدی بن ارطاۃ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو خط لکھا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب تک انہیں جسمانی سزا نہ دی جائے وہ پورا خراج ادا نہیں کرتے لہٰذا انہیں مارنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب میں لکھا:

"مجھے اس پر بہت حیرت ہو رہی ہے کہ تم نے مجھ سے انسانوں کو عذاب دینے کی اجازت کیسے مانگ لی' گویا کہ تم نے یہ سمجھ لیا کہ اللہ کے عذاب کے آگے میں تمہارے لئے وقایہ بن جاؤں گا' اور شاید تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں رضامندی سے اجازت دے دوں گا تو تم اللہ کی ناراضگی سے بھی بچ جاؤ گے' جو شخص آسانی سے پورا ٹیکس ادا کر دے تو اس سے لے لو' وگرنہ اس سے حلف لو' (ان کے جھوٹی قسم کھانے کی صورت میں) یہ اپنے گناہ لے کر اللہ کے پاس حاضر ہوں یہ اس سے بہتر ہے کہ میں انہیں تنگ کرنے کا وبال لے کر وہاں پہنچوں" (۲۶)

حضرت عمرؓ کے پاس ایک دفعہ بہت زیادہ مال لایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے لگتا ہے کہ تم نے لوگوں کو تباہ کر دیا ہے' انہوں نے کہا کہ ہم نے صاف ستھرے طریقے سے ضرورت سے زائد میں سے لیا ہے' حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا رے اور لٹکائے بغیر لیا ہے' انہوں نے کہا "جی ہاں" آپ نے کہا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے یہ کام نہ تو مجھ سے کروایا اور نہ ہی میرے دورِ حکومت میں ہونے دیا (۲۷)

حضرت علیؓ نے ایک شخص کو عامل بنا کر بھیجتے وقت لوگوں کے سامنے تو اسے یہ کہا کہ خراج کا ایک درہم بھی نہیں چھوڑنا' اسی طرح کے کچھ اور سخت الفاظ کہے' بعد میں تنہائی میں بلا کر یہ کہا کہ اصل حکم تمہیں اب دیتا ہوں جس کی اگر نافرمانی کی تو تمہیں معزول کر دوں گا' وہ یہ کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خراج کی وصولی کے سلسلے میں کسی کا گدھا گائے گرمیوں اور سردیوں کے کپڑے (یعنی روزمرہ ضرورت کی اشیاء) نہ بیچنا اور ان سے نرمی سے برتنا (۲۸)

۴ء۳ء۲۔ ٹیکس حکام کا محاسبہ :

امام ابو یوسفؒ ہارون الرشید کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میری رائے یہ ہے کہ کچھ دین دار اور امانت دار لوگوں کو اس بات پر مامور کیا جائے کہ وہ ٹیکس حکام کے طرز عمل کا جائزہ لیتے رہیں کہ کہیں وہ لوگوں پر ظلم وزیادتی تو نہیں کر رہے اور کیا وہ طے شدہ طریقِ کار اور قواعد کے مطابق ہی وصولی کر رہے ہیں' اگر قابل اعتماد ثبوت ملنے کے بعد ایک آدھ کو بھی سزا ہو گئی تو باقی خود بخود محتاط ہو جائیں گے وگرنہ ان کی جرات بڑھتی چلی جائے گی' امام ابو یوسفؒ کی رائے تو یہ ہے کہ جس کے بارے میں خیانت' ظلم اور حرام خوری ثابت ہو جائے اسے کسی بھی منصب کے لئے نااہل قرار دے دیا جائے۔ امام ابو یوسفؒ کے الفاظ یہ ہیں :

"فحرام علیک استعماله والا ستعانة به وان تقلده شیئاً من امر رعیتک او تشرکه فی شئی من امرک" (۲۹)

عہد رسالت ﷺ میں عاملین زکوٰۃ پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی' یہی انداز خلفاء راشدین کا زکوٰۃ' عشر اور خراج وغیرہ کے محصلین کے بارے میں تھا۔ ان کی کارکردگی اس حوالے سے نہیں ناپی جاتی تھی کہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ مال اکٹھا کیا یا نہیں' نہ ہی انہیں مخصوص ٹارگٹ دے کر یہ ذمہ داری سونپی جاتی تھی کہ یہ ہدف ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے' بلکہ ان عمال کی نگرانی دو باتوں میں کی جاتی تھی۔

۱۔ کہیں وہ اپنے منصب اور مقام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ذاتی مفاد تو حاصل نہیں کر رہے۔

چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے ابن اللتبیہ نامی شخص کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا' انہوں نے واپس آکر کہا کہ یہ تو زکوٰۃ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے' حضور اقدس ﷺ نے انہیں ڈانٹا اور فرمایا کہ اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہ بیٹھے رہے پھر دیکھتے کہ تمہیں کوئی ہدیہ دیتا ہے یا نہیں' مقصد یہ تھا کہ یہ تحائف تمہیں تمہارے ذاتی تعلقات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس منصب کی وجہ سے ملے ہیں' اس لئے ان کا لینا تمہارے لیے درست نہیں تھا۔

۲۔ کیا یہ عمال طے شدہ قواعد پر پورا پورا عمل کر رہے ہیں یا نہیں' اور اس سلسلے میں ان عمال کو حضور اقدس ﷺ کی طرف سے پوچھ گچھ کا خطرہ لگا رہتا تھا' مثلاً آنحضرت ﷺ کی طرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ایک ہدایت یہ تھی کہ اونٹوں کی زکوٰۃ میں درمیانے درجے کے اونٹ لئے جائیں۔نہ زیادہ لاغر اور کمزور ہوں اور نہ ہی بہت قیمتی' ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضور اقدس ﷺ کی طرف سے زکوٰۃ کی وصولی کے لئے گئے' ایک زکوٰۃ دینے والے نے بہت عمدہ اونٹنی پیش کی' انہوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔اس نے اس سے ذرا کم درجے کی پیش کی' وہ قبول کرنے سے بھی انکار کردیا' اس نے تیسری اس سے ذرا کم درجے کی پیش کی تو انہوں نے قبول تو کرلی' لیکن یہ کہا کہ مجھے یہ ڈر ہے کہ حضور اقدس ﷺ کہیں ناراض نہ ہوں کہ تم اس شخص سے عمدہ اونٹنی لے آئے ہو (۳۰)

عہد رسالت میں اس طرح کے اور بھی متعدد واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمال کو اصل فکر اس بات کی نہیں ہوتی تھی کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ محاصل جمع کرنے ہیں' بلکہ اصل فکر یہ ہوتی تھی کہ طے شدہ اصول پر عمل ہو۔

۵ ء ۳ ء ۲۔ **ٹیکس کی تشخیص میں احتیاط :**

عموماً ہوتا یوں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے اثاثہ جات یا آمدن ظاہر کرتا ہے تو اس کے عام معیار زندگی اور دوسرے قرائن و شواہد کے ذریعے اس کے بیان کے صحیح یا غلط ہونے کا جائزہ لیا جاتا ہے' اس سلسلے میں عموماً بہت باریک بینی سے کام لیا جاتا ہے۔ تمہارے بچے فلاں سکول میں پڑھتے ہیں۔ تمہارے یوٹیلٹی بلز اتنے ہیں' تمہارا رہن سہن ایسا ہے۔لہٰذا تمہاری آمدن لازماً اتنی ہوگی' حالانکہ بعض اوقات اس شخص نے بڑی مشکل سے اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اچھی اور اعلیٰ تعلیم دلانے کا خواہش مند ہو' اور نہ معلوم کس طرح اپنی محدود آمدن میں جوڑ توڑ کر کے اور اپنی نہ معلوم کتنی ضرورت اور شوق دبا کر وہ ان کی تعلیم کا خرچہ برداشت کر رہا ہو' لیکن ٹیکس حکام نے فرض کر رکھا ہوتا ہے یا کہ اس کی حقیقی آمدن اس کی ظاہر کردہ آمدن سے بہت زیادہ ہے' اور وہ کسی طرح مطمئن ہونے کا نام نہیں لیتے۔

شریعت کا مزاج اس معاملے میں بظاہر اس سے مختلف معلوم ہوتا ہے' اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیکس دہندگان اپنی آمدن یا اثاثے کم ظاہر کرتے ہیں اور ان کے بیان کی صداقت جانچنے کے لئے دوسرے قرائن و شواہد کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے' لیکن اس معاملے میں خاصی احتیاط کی ضرورت ہے' اس طرح کی باتوں کی وجہ سے کسی کا پیچھا تبھی کیا جانا چاہے جبکہ قرائن و شواہد بہت ہی زیادہ ناقابل تردید ہوں۔ مثلاً وہ اپنی آمدن چار پانچ ہزار ماہانہ ظاہر کر رہا ہے جبکہ وہ عالی شان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مکان میں رہتا' بہترین گاڑیوں میں سفر کرتا ہے اور چار پانچ ہزار روپے اس کا صرف بجلی کا بل ہے۔

حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں عشر اور یہودیوں کے باغات سے دیگر محاصل کی وصولی سے پہلے ایک سروے کیا جاتا تھا۔ جس میں ماہرین یہ اندازہ لگایا کرتے تھے کہ فلاں شخص کے باغات میں اتنا پھل اترے گا' تاکہ اس کے حساب سے بعد میں وصولی کی جائے اور بیت المال کو بھی پیشگی معلوم ہو کہ تقریباً اس مد میں اتنی آمدن ہو گی' اس عمل کو "خرص" کہا جاتا تھا' اس کے باقاعدہ ماہرین ہوتے تھے جنہیں "خارص" کہا جاتا تھا اور عموماً ان کا تخمینہ صحیح ہوتا تھا۔ اس کے باوجود حضور اقدس ﷺ کی ہدایت تھی کہ ایک تہائی یا کم از کم ایک چوتھائی تک مالکان کو چھوٹ دی جائے۔ (۳۱) مثلاً اگر خارص کا پھل پکنے سے پہلے کسی خاص باغ میں اندازہ یہ تھا کہ اس میں ساٹھ من کھجوریں ہوں گی' لیکن مالک کہتا ہے کہ عملاً اس سے کم ہوئی ہیں تو چالیس پینتالیس من تک اس کے بیان کو قبول کر کے اس کے مطابق ہی اس سے عشر وغیرہ وصول کرو' البتہ اگر خارص کا اندازہ ساٹھ من کا تھا لیکن وہ کہتا ہے کہ تیس من کھجوریں ہوئی ہیں تو ذرا چھان بین کر لی جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے اثاثہ جات یا آمدن کا اندازہ لگانے میں اسے ایک معقول حد تک چھوٹ دینی چاہیے اور بہت زیادہ باریک بینی سے کام لے کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہیے۔

شریعت کا اصل اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی مصارف پر تقسیم حکومت کا کام ہے' قرآن کریم میں "خذمن اموالھم صدقۃ" (۳۲) لیکن اس کے باوجود خلافت راشدہ کے دور میں صرف اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ لی جاتی تھی' اموال باطنہ کی نہیں (اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ دو فقہی اصلاحیں ہیں) اس کی حکمت بھی یہی ہے کہ لوگوں کے اموال میں بہت زیادہ تحقیق و تفتیش نہ کرنا پڑے۔

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

"ان الامیرء اذا اتبغی الریبۃ فی الناس افسدھو" (۳۳)

(یعنی امیر جب لوگوں پر شک و شبہ کرنے لگ جائے تو اس سے لوگ اور بگڑتے ہیں)

۴ء۲۔ پرائیویٹ سیکٹر کو منصوبوں میں شامل کرنا:

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ممکن ہو وہاں بجائے اس کے کہ لوگوں سے ٹیکس لے کر خود حکومت اسے خرچ کرے کوئی رفاہی منصوبہ بنا کر مالدار لوگوں کو رضاکارانہ طور پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شرکت کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے اپنے دور میں بھوک کے مسئلے سے نمٹنے کے لئے مسجد میں ایک متعین جگہ پر کھجوروں کے خوشے لٹکانے کا منصوبہ شروع کیا تھا تاکہ حاجت مند وہاں سے لے کر کھالیں' باغات والے صحابہ کرامؓ کو ترغیب دی تھی کہ وہ اپنے ہر دس خوشوں میں سے ایک خوشہ یہاں لٹکادیا کریں (۳۴) اسی طرح یہ سلسلہ بھی چلتا تھا کہ جہاں اونٹوں کو پانی پلایا جاتا تھا وہاں حاجت مند پہنچ جاتے تھے اور حضور اقدس ﷺ نے فرمایا تھا کہ جس دن اونٹنی کو دودھ پلانے کے لئے جاؤ اس دن اس کا دودھ نکال کر وہاں پر موجود مساکین کو پلا دو (۳۵) یاد رہے کہ اونٹ کو کئی دن کے بعد پانی پلانے کے لئے لایا جاتا تھا۔

البتہ بعض علماء کی رائے کے مطابق یہ محض ایک ترغیب نہیں تھی بلکہ لازمی حکم تھا اور یہ زکوٰۃ کے علاوہ تھا' اس صورت میں یہ اجتماعی مفاد کے لئے ٹیکس (نوائب) عائد کرنے کی صریح دلیل ہوگی۔

۲۶۵۔ کیا حکام کی غلطیوں کی وجہ سے شہریوں کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے؟

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کاروبارِ مملکت چلانے کے لئے بوقت ضرورت حکومت کو خاص حدود و قیود کے ساتھ ٹیکس لگانے کی اجازت ہے۔ اس سلسلے میں حکام کی ذمہ داریوں کا ذکر بھی ہو چکا' ان کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ان ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی آمدن کو مقدس امانت سمجھ کر انتہائی احتیاط کے ساتھ استعمال کریں' لیکن اگر وہ ان ذمہ داریوں یا ان میں سے بعض میں کوتاہی برتیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ چیز اس بات کا جواز فراہم کرتی ہے کہ شہری ٹیکس کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری ادا ہی نہ کریں۔ ہمارا یہ سوال ان ٹیکسوں کے بارے میں ہے جن کا آدمی میں تحمل ہو اور جنہیں فقہاء نے درست اور ان کی ادائیگی کو ضروری قرار دیا ہے۔ (اس لئے کہ ناقابل تحمل بوجھ اور صریح زیادتی سے بچنے کے سلسلے میں شریعت کے احکام الگ ہیں) تو جس صورت کے متعلق یہ سوال ہے اس میں اصل یہی ہے کہ شہریوں کو اپنی استطاعت کے مطابق بہر حال اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ اول تو شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر دوسرا فریق اپنی ذمہ داری پوری ادا نہیں کرتا تب بھی تم اپنی ذمہ داری پوری کرو' حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم ایسا نہ کہو کہ اگر دوسرے لوگ ٹھیک کام کریں گے تو ہم بھی کریں گے۔ اگر لوگ غلط چلیں گے تو ہم بھی غلط چلیں گے' بلکہ دلوں میں یہ فیصلہ کرلو کہ ہم ہر حال میں اچھے کام ہی کریں گے۔ (۳۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے یہ کہ بعض اوقات مالی معاملات میں یہ فیصلہ کرنے میں کہ مجھ پر زیادتی ہو رہی ہے انسان سے مبالغہ آرائی بھی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ انسان کی جیب سے جب پیسہ نکلتا ہے تو اسے دکھ ضرور ہوتا ہے' ایک شاعر نے انسان کے اس مزاج کو یوں بیان کیا ہے :

اگر جہاں طلبی مضائقہ نیست وگر زر طلبی سخن دریں است

خود حضور اقدس ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے میں محصلین زکوٰۃ کی کڑی نگرانی اور اتنی احتیاط کے باوجود ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اس خیال میں مبتلا تھے کہ یہ محصلین ہم پر ظلم کرتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ ایسے مواقع پر استطاعت کے باوجود قانونی ذمہ داری پوری نہ کرنے سے کرپشن کو فروغ ملتا ہے۔ اس شعبے میں کرپشن ٹیکس دہندہ اور ٹیکس حکام کی مشترکہ خواہش کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں فائدہ صرف ٹیکس ملازمین کا ہوتا ہے۔ سرکاری خزانہ اور ٹیکس دہندگان دونوں خسارے میں رہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہی کرپشن جب جڑ پکڑ لیتی ہے تو خود ٹیکس دہندگان کے لئے بھی وبالِ جان بن جاتی ہے' رشوت کا ریٹ بڑھ جاتا ہے' دوسری طرف سرکاری خزانے میں ٹیکس نہ جانے کی وجہ سے ٹیکس کی شرح بڑھ جاتی اور اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔

چوتھی سب سے بڑی خرابی اس میں یہ ہے کہ جو لوگ واقعتاً ٹیکس دے سکتے ہیں اور انہیں دینا چاہیے لیکن بدقسمتی سے یہی لوگ ٹیکس سے بچنے کی زیادہ پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے نچلا طبقہ جو نہ تو عموماً احتجاج کی پوزیشن میں ہوتا ہے اور نہ ہی سمجھوتہ بازی کی' وہ ٹیکسوں کے بوجھ میں اور زیادہ دبتا چلا جاتا ہے' بالواسطہ ٹیکسوں کی ایسی بھرمار ہوتی ہے کہ ایک عام آدمی یوٹیلٹی بلز' صابن کی ٹکیہ' دیا سلائی کی ڈبی' سٹیشنری اور چھوٹی موٹی چیزوں کے راستے اپنی آمدن کا ایک قابلِ ذکر حصہ ٹیکسوں کی ادائیگی میں خرچ کر دیتا ہے۔

اس لئے صاحبِ استطاعت لوگوں کو بہر حال اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنی قانونی ذمہ داریوں کو پورا کریں اور ٹیکس حکام کو بھی اس راستے پر لانے کے لئے اپنا عزم اور ہمت استعمال کریں۔ ٹیکس دہندگان' ٹیکس حکام اور ٹیکس لائرز سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ مل جل کر قانون پسندی کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

ظالم اور فضول خرچ حکمران صحابہؓ کے زمانے میں ہی وجود میں آگئے تھے'۔ ان حکام کو زکوٰۃ کی ادائیگی کے سلسلے میں بعض صحابہؓ کے اقوال پیش کر کے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابو صالح کہتے ہیں کہ میرے پاس نصاب کے برابر مال موجود تھا تو میں نے سعد بن ابی وقاصؓ ابن عمرؓ ابو ہریرہؓ ابو سعید خدریؓ سے پوچھا کہ کیا یہ زکوٰۃ حکومت کو دوں؟ جبکہ حکومت یہ زکوٰۃ لے کر جو کچھ کرے گی آپ کو معلوم ہے' ان تمام حضرات نے فرمایا ہاں انہیں دے دو۔(۳۷)

قزعہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ میرے پاس مال ہے' اس کی زکوٰۃ کسے ادا کروں' انہوں نے فرمایا ان حکام کو دے دو' میں نے پوچھا کہ وہ تو اس سے اپنا لباس اور خوشبو بنائیں گے' ابن عمرؓ نے فرمایا' اگرچہ وہ ایسا کریں (یعنی اس کا وبال ان پر تو ہوگا تم پر نہیں)(۳۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوالہ جات

۱۔ صحیح البخاری' حدیث نمبر ۱۴۵۸ (باب لاتوخذ کرائم اموال الناس فی الصدقة)

۲۔ حجۃ اللہ البالغۃ' ج ۲' ص ۹۳' مکتبہ سلفیہ' لاہور

۳۔ حوالہ بالا' ج : ۲' ص ۴۵

۴۔ صحیح البخاری' حدیث نمبر ۷۱۲۱' کتاب الفتن

۵۔ التوبۃ : ۶۰

۶۔ سنن ابو داؤد' حدیث : ۱۶۲۷' کتاب الزکوٰۃ' (باب من یعطی من الصدقة وحدالغنی)

۷۔ ابو یوسف' کتاب الخراج' ص ۲۶' ادارۃ القرآن کراچی ۱۹۸۷ء

۸۔ حوالہ بالا' ص ۴۵

۹۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو : العثمانی : ظفر احمد' ج ۱۲' ص ۳۶۶ تا ۳۷۲' ادارۃ القرآن کراچی

۱۰۔ کاسانی' بدائع الصنائع' ج ۷' ص ۱۶' مکتبہ رشیدیہ' کوئٹہ

۱۱۔ صحیح البخاری' حدیث نمبر ۶۸۳۰' کتاب الحدود' باب رجم الحبلی من الزنا

۱۲۔ المرغینانی' الہدایۃ (مع فتح القدیر) ج ۶' ص ۲۳۲' مکتبہ رشیدیہ' کوئٹہ

۱۳۔ ابن الہمام' فتح القدیر' ج : ۶' ص ۲۳۲

۱۴۔ الشاطبی' الاعتصام' ج ۲' ص ۱۲۱' دارالمعرفہ بیروت ۱۹۸۲ء

۱۵۔ حوالہ بالا' ج ۲ ص ۱۲۲

۱۶۔ فتح القدیر' ج ۶' ص ۲۳۲

۱۷۔ النساء : ۵۹

۱۸۔ ملاحظہ ہو : ابو یعلی' الاحکام السلطانیہ' ص ۔۔۔۔۔۔' الماوردی' الاحکام السلطانیہ

۱۹۔ کتاب الخراج' ص ۴۸'۳۷

۲۰۔ ابو عبید : القاسم بن سلام' کتاب الاموال' ص ۵۰' طبع اول ۱۹۸۶ء' دارالکتب العلمیہ' بیروت

۲۱۔ جامع الترمذی' کتاب الزکوٰۃ' باب فی المعتدی فی الصدقة

۲۲۔ ملاحظہ ہو : البنوری' معارف السنن' ۵/ ۳۵۴ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

۲۳۔ قطب ابراہیم محمد' النظم المالیۃ فی الاسلام' ص ۱۰۳' الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب ۱۸۰

۲۴۔ کتاب الخراج' ص ۱۰۷

۲۵۔ حوالہ بالا' ص ۱۰۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۶۔ حوالہ بالا، ص ۱۱۹
۲۷۔ ابو عبید، کتاب الاموال، ص ۴۸
۲۸۔ حوالہ بالا، ص ۴۹
۲۹۔ کتاب الخراج، ص ۱۱۱
۳۰۔ سنن ابو داؤد، حدیث نمبر: ۱۶۷۶، کتاب الزکوٰۃ، باب فی زکوٰۃ السائمۃ
۳۱۔ سنن ابو داؤد، حدیث نمبر: ۱۶۰۲، کتاب الزکوٰۃ، باب فی الخرص
۳۲۔ التوبہ: ۱۰۳
۳۳۔ مشکوٰۃ، ص ۳۲۲، کتاب الامارۃ والقضاء (از ابو داؤد و بیہقی)
۳۴۔ سنن ابو داؤد، حدیث نمبر: ۱۶۵۹، کتاب الزکوٰۃ، باب حقوق المال
۳۵۔ ایضاً، حدیث نمبر: ۱۶۵۶
۳۶۔ کنز العمال، حدیث نمبر: ۴۳۰۳۵
۳۷۔ اعلاء السنن، ج ۹، ص ۵۱، حدیث نمبر: ۲۳۷۶
۳۸۔ ایضاً، حدیث نمبر: ۲۳۷۷

© rasailojaraid.com